مرزا مقبول بیگ بدخشانی

علی قلی والہ داغستانی

مولف ریاض الشعرا

علی قلی والہ داغستانی کا آبائی وطن ایران تھا لیکن ہلاکو خاں کے حملوں اور خلافتِ عباسیہ کے انقراض (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) پر ایران کے متعدد خاندان ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ بعض سرزمینِ حجاز کی طرف چلے گئے، بعض نے برصغیر پاک و ہند کا رخ کیا۔ والہ کے آبا و اجداد سربراہِ خاندان کے ساتھ بحیرۂ خزر سے پار داغستان[1] چلے گئے۔

ایران سے آنے والے یہ لوگ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ مقامی قبائل لزک[2] قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے لزکی کہلاتے تھے اور جو قبیلے ملک شام سے آکر یہاں بسے تھے، وہ شام سے تعلق رکھنے کی وجہ سے "شامخال" یا شمخال" کہلاتے تھے۔ انھوں نے نو واردوں کا پُرخلوص خیر مقدم کیا، بلکہ غنیمت سمجھا کہ یہ برادرانِ اسلام، ان کے وطن میں آگئے ہیں۔ شمخالوں نے رفتہ رفتہ ان کی ریاست بھی قبول کر لی اور والہ کے آبا و اجداد مقامی لوگوں کی نسبت سے شمخال کہلانے لگے۔

جنوبی داغستان عثمانی ترکوں اور ایرانیوں کی پیہم یلغاروں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ عباس اعظم صفوی (۹۹۶ھ تا ۱۰۳۸ھ — ۱۵۸۷ تا ۱۶۲۸ء) کے عہد میں بھی اس کے قزلباشوں کا لشکر جنوبی داغستان پر حملہ آور ہوا، اہلِ داغستان

---

[1] داغستان۔ داغ یا طاغ (ترکی لفظ) بمعنی پہاڑ۔ داغستان یعنی پہاڑوں کی سرزمین۔ داغستان کے جنوب میں ایران کا صوبہ آذربائیجان ہے اور مشرق میں بحیرۂ خزر۔ یہ علاقہ جنوری ۱۹۲۱ء میں روس میں شامل ہوا۔ اب یہ رشین سوویٹ فیڈریٹڈ سوشلسٹ ری پبلک (R.S.F.S.R) کہلاتا ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا، ج ۶، ۱۷۶۸، ص ۹۷۲)

[2] قبیلہ لزک دریائے سمرہ سے موجودہ داغستان کے جنوب میں شابیران تک پھیلا ہوا ہے۔ (البلاذری: طبع ڈغویہ George ، ص ۲۰۸)

[3] تیموری فتوحات اور عثمانی تسلط (۸۶۵ تا ۱۰۱۵ھ / ۱۴۶۱ تا ۱۶۰۶ء) کے زمانے میں داغستان میں اسلام کو فروغ حاصل تھا، لیکن وہاں کے مسلمان قبائل کا یہ دعویٰ ہے کہ انھیں ابومسلم خراسانی نے مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ (البلاذری: فتوح البلدان طبع ڈغویہ George ، ص ۲۰۸

نے پامردی سے ان کا مقابلہ کیا اور انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ شاہ عباس اعظم نے اب مصلحت اسی میں سمجھی کہ کشیدگی دور کر کے مصالحت کی راہ ہموار کی جائے۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد باہمی رسل و رسائل اور نامہ و پیام سے کشیدگی کا غبار چھٹ گیا اور مراسم یگانگت استوار ہو گئے۔ بالآخر شاہ عباس نے والہ کے آبا میں سے الدار خاں شملخال سے یہ خواہش کی کہ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو اس کے ہاں فرزند کی حیثیت میں بھیج دے، تاکہ باہمی موانست اور یک جہتی میں اضافہ ہو۔ الدار خاں اس پر آمادہ ہو گیا اور اپنے چھوٹے بیٹے الخاص خاں کو خیر سگالی کے طور پر عباس اعظم کے ہاں بھیج دیا۔ الخاص خاں نے شاہی محلوں میں شہزادوں کی طرح پرورش پائی اور عزت و جاہ کے بلند مراتب پر پہنچا۔ اسے صفی قلی خان کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، ایروان کی بیگلربیگی کا منصب بھی سونپا گیا۔ اس حیثیت میں اُسے خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی شادی ایک امیر میرزا حسن خان استجالو کے گھرانے میں سلطان جنابہ بیگم کے ساتھ ہوئی، جس کے بطن سے دو بیٹے نظر علی خاں اور مہر علی خاں اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ آگے مہر علی خاں کے چھ بیٹے ہوئے۔ لطف علی خاں، فتح علی خاں، رستم علی خاں، کلب علی خاں، حسن علی خاں اور محمد علی خاں، جو مولف تذکرہ ریاض الشعرا علی قلی والہ کا باپ تھا۔ یہ افراد خاندان صفوی حکمرانوں کے مقربین خاص میں سے تھے۔

علی قلی والہ[۴] داغستانی کے والد محمد علی خاں کو ایروان اور آذربائیجان کی حکومت کے علاوہ ۱۱۲۸ھ/ ۱۷۱۵ء میں سپہ سالاری کا منصب اعلیٰ بھی سونپا گیا، جو اس نے بڑی وفاداری سے انجام دیا۔ آخر اُسے قندھار کی مہم پر بھیجا گیا، لیکن نخجوان ہی پہنچا تھا کہ علالت کی بنا پر ۱۱۲۹ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

والہ کی پیدائش ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ - ۱۳ء میں اصفہان[۵] میں ہوئی۔ والد کی وفات پر اس کی سرپرستی اس کے چچاؤں بالخصوص حسن علی خاں نے کی۔ شاہ عباس ثانی (۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء تا ۱۰۷۷ھ/ ۱۶۶۷ء) کے زمانے میں بھی والہ کے چچا اکابر ملک میں شمار ہوتے تھے۔ شاہ عباس ثانی کے بعد اس کا بیٹا شہزادہ صفی میرزا، شاہ سلیمان کے نام سے تخت نشین ہوا (۱۰۷۷ھ تا ۱۱۰۵ھ/ ۱۶۹۳ء) اس زمانے میں بھی والہ کے چچا

---

۴ علی قلی خان بہادر، والہ تخلص از اولاد حضرت عباس عم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم است۔ بحوالہ تذکرۂ مردم دیدہ، مولفہ عبدالحکیم حاکم، باہتمام ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۹۸

۵ ہرمن ایتھے: Catalogue of Persian Manscripts in the India office Library، شمارہ ۱۷۰۸، ص ۹۲۵

بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، بالخصوص لطف علی خاں سپہ سالار اور فتح علی خاں اعتماد الدولہ وزیر مملکت تھا۔ شاہ سلیمان کی وفات کے بعد ایران کی حکومت سلطان حسین صفوی نے سنبھالی (۱۱۰۵ھ/ ۱۶۹۴ء تا ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۲ء) جو کمزور اور بے بصیرت حکمران تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں بعض خائن امرا اور عالم نما ریاکاروں کو بہت اثر و رسوخ حاصل ہوا لیکن محبِ وطن شرفا سخت دل برداشتہ رہے۔ حکومت کے استحکام کی طرف کوئی توجہ نہ تھی، جس کی بنا پر سلسلۂ صفویہ زوال پذیر ہونا شروع ہوا۔ اس صورتِ حال میں محمود خاں غلزئی لشکر کے ساتھ قندھار سے چلا اور سیستان سے ہوتا ہوا کرمان آپہنچا۔ وہاں کے لوگوں پر طرح طرح سے ظلم و ستم کیے، آخر والہ کا چچا لطف علی خاں لشکر لیے ہوئے کرمان آیا اور محمود خان غلزئی کو شکست دے کر ملک سے نکال باہر کیا۔ لطف علی خاں اس فرض سے عہدہ برآ ہو کر شیراز آگیا تاکہ حفظ ماتقدم کے طور پر مزید لشکر تیار کر کے ملکی تحفظ کے لیے جد و جہد کرے، لیکن بجائے اس کے کہ لطف علی خاں کو اس کی فرض شناسی اور جواں مردانہ کارگزاری کا صلہ ملتا، بعض خائنوں کے بہکانے پر کہ لطف علی خاں خود حکمران بننے کے خواب دیکھ رہا ہے، بادشاہ نے اسے معزول کر دیا۔[۵۶] اس وقت والہ کا چچا فتح علی خاں وزیر مملکت تھا، اس نے بیرونی حملہ آوروں کو روکنے کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے، لیکن حکیم باشی نے اس پر بھی خود مختاری حاصل کرنے کا اتہام لگایا۔ اس اتہام پر بادشاہ نے اسے ۱۱۳۳ھ میں منصبِ وزارت سے معزول کر کے بصارت سے محروم کر دیا۔[۵۷] والہ نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ فتح علی خاں کی معزولی کے بعد ان کے سارے اعزہ کو ان کے عہدوں سے الگ کر دیا گیا۔

محمود خان غلزئی پھر ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۲ء میں پچیس ہزار کا لشکر لیے ہوئے کرمان آیا اور اسے مسخر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی فتوحات کا سلسلہ اور بھی بڑھتا گیا۔ صفوی افواج نے کہیں بھی پائمردی کا ثبوت نہ دیا، چنانچہ وہ شہر بہ شہر فتح کرتا ہوا اصفہان پہنچا اور اسے بھی فتح کر لیا، یہ اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ صفوی بادشاہ کے پاس جب کوئی چارۂ کار نہ رہا تو اپنی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے محمود خان کو اپنا فرزند قرار دے کر تاجِ شاہی اس کے سر پر رکھا اور خود ایران کے تخت و تاج سے دست بردار

---

۵۶ عبداللہ رازی: تاریخ مفصل ایران، تہران ۱۳۳۵ھ، ص ۴۰۸، ۴۰۹

۵۷ ایضاً، ص ۴۰۹

ہوگیا ۵۸

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر شاہ حسین صفوی کے بیٹے شاہ طہماسپ نے فرح آباد اور مازندران میں نادر شاہ افشار کی زیرِ حمایت ۱۱۳۵ھ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، اس طرح نادر شاہ کے لیے حکمرانی کی راہ ہموار ہوگئی۔ اس نے غلزئی افاغنہ کا مقابلہ کیا اور انھیں شکست دے کر ملک بدر کر دیا۔

علی قلی والہ کو نہ کوئی منصب مل سکا تھا، نہ ملکی سیاست ہی میں کوئی اس کا حصہ تھا، اس نے اپنے بزرگوں کو معزول ہوتے بھی دیکھا اور محبوس ہوتے ہوئے بھی۔ صفوی دور کا زوال بھی اس کے دیکھتے دیکھتے ہوا، اور پھر حملہ آور افاغنہ کے عارضی تسلط کے دوران ان کے ہاتھوں جو المیہ پیش آیا اس کی مختصر سی سرگزشت یہ ہے :

والہ کی پرورش اس کے چچا حسن علی خاں کے ہاں ہوئی تھی۔ حسن علی خاں کی بیٹی خدیجہ سلطان اور وہ ایک ہی گھر میں تھے اور ایک ہی مکتب میں زیرِ تعلیم تھے۔ دونوں میں محبت کا رشتہ استوار ہوگیا۔ اس عرصے میں خدیجہ سلطان اس سے منسوب بھی ہوگئی۔ یہ افراتفری کا عالم تھا، اسی اثنا میں ان کی شادی کی تیاری ہونے لگی۔ والہ لکھتا ہے :

" والدۂ معظمۂ آن دُرِ دُرجِ خوبی، بوالدۂ این برگشتہ روزگار دل افگار فرمود کہ گردونِ بوقلمون برسر زبُونیست و گردش فلکِ غدار در مقام واژگونی ہم است کہ غنچۂ ناشگفتہ ام بتاراجِ خزانِ حوادث رود و گلِ نودمیدہ ام از سردمہریٔ ایام پژمردہ گردد و بہتر آنست کہ دامنِ مروت از خارِ تکلفات رسمی برچیدہ یا سہل ترین وضعی این دو بیدل را بیکدیگر بسپاریم " ۵۹

اس کے بعد فلکِ شعبدہ باز نے ایک اور گل کھلایا۔ محمود خان غلزئی کے مقربین میں سے ایک شخص کریم داد خان نے خدیجہ سلطان کے لیے شادی کا پیغام بھیج دیا۔ اس کی والدہ نے ہر چند انکار کیا لیکن فلکِ کج رفتار کو یہی منظور تھا، آخر بہت رد و قدح کے بعد کریم داد خان کے ساتھ اس کی شادی ہوگئی ۶۰۔ علی قلی والہ لکھتا ہے:

---

۵۸ عبداللہ رازی : تاریخ مفصل ایران، تہران ۱۳۳۵ھ، ص ۴۰۹

۵۹ ریاض الشعرا، ن و، ورق ۱۹۳

۶۰ دیوان رتن سنگھ زخمی : انیس العاشقین قلمی، شمارہ ۲۴ I . F . P پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۶۸ ب

" بعد از وقوعِ این واقعۂ جانسوز و بلائے غم اندوز، از پردۂ نام و ننگ برآمدہ، در لیل و نہار طائفِ
دچۂ یار بودم، تا آنکہ رفتہ رفتہ این حکایت پنہان بر ہر کس عیان گردید"[11]

اس المیے کے بعد والہ نے ترکِ وطن کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں والہ برصغیر پاکستان
ند آنے کی تیاری کرنے لگا۔ ہرمن ایتھے کے بیان کے مطابق والہ نادر شاہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار
ی وجہ سے ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔[12] لیکن والہ کی الم ناک محرومی کے پیشِ نظر یہ بیان درست معلوم نہیں
وتا۔ اس کے بزرگوں کا جو حال ہوا، اس کا بیان اوپر آچکا ہے اور والہ کا تو نہ سیاست میں عمل دخل
ا، نہ وہ کسی منصب پر فائز تھا کہ اسے نادر شاہ کا خوف لاحق ہوتا۔ بہرحال اس نے اپنی عم زاد کی مفارقت
ے داغ لیے ہوئے وطن کو خیر باد کہا۔

والہ کے ذیل کے شعر میں اس کی حسرتوں کی عکاسی نمایاں ہے:

بُبرد بادِ غبارم، ز کوئی یار افسوس　　　زمن نماند نشانی، در آن دیار افسوس

والہ لاہور، ملتان اور ٹھٹھہ سے ہوتا ہوا دہلی پہنچا، وہاں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری اور بعض
ذکروں کے مطابق روشن الدولہ[13] کی وساطت سے مغل بادشاہ محمد شاہ (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء)
ے دربار سے وابستہ ہوا اور چار ہزار پیادہ اور دو ہزار سوار کے منصب پر فائز ہوا، ظفر جنگ کا خطاب ملا
را میر توزک ثانی کے اعزاز سے نوازا گیا۔[14] احمد شاہ (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء تا ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء) کے عہد میں اسے
شش ہزاری منصب پر فائز کیا گیا اور خان زمان ظفر جنگ کے خطاب سے بھی سرفراز ہوا۔ آخر میں عالم گیر
ثانی کے عہد میں (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء تا ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء) اسے ہفت ہزاری منصب کا اعزاز حاصل ہوا۔[15]

دہلی میں علی قلی والہ اپنے فرائض منصبی کے علاوہ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہا۔ والہ کا رابطہ

---

[11] ریاض الشعرا، ن ۱، ورق ۱۹۵ ب

[12] کیٹلاگ انڈیا آفس لائبریری، (مخطوطات) شمارہ ۱۷۰۸

[13] عبدالحکیم حاکم: مردم دیدہ، باہتمام ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ص ۱۰۰۔ نیز دیکھیے سی آر سٹوری: پرشین لٹریچر، ج ۱، حصہ ۲، ص ۸۳۲۔

[14] سپرنگر: کیٹلاگ، مخطوطات عربی و فارسی، ص ۵۸۹

[15] چارلس ریو: کیٹلاگ، مخطوطات فارسی، ص ۱۵

اس کی منسوبہ خدیجہ سلطان سے تو ختم ہو گیا تھا لیکن اس کی یاد نے یہاں بھی اسے بے تاب رکھا، جیسا کہ
کے شعر سے واضح ہے :

فریاد کسان بود ز بیگانہ و من   از دختر عم خویش دارم فریاد

خدیجہ سلطان کی وفات وطن ہی میں ہوئی، اس کی مختصر سی سرگزشت یہ ہے :

نادر شاہ کے ہاتھوں غلزئی افاغنہ کا تسلط ختم ہوا تو کشت و خون کے دوران کریم داد خاں مارا گیا
خدیجہ سلطان کربلائے معلی کے عتبات عالیات کی زیارت کے لیے روانہ ہوئی جیسا کہ اس نے منت
مانی تھی[۱۶] واپس ہوئی تو اپنے عم زاد والکی تلاش میں برصغیر پاکستان و ہند آنے کی تیاری کی لیکن زمانے
نے ساتھ نہ دیا - طبیعت علیل تھی - دشت و بیابان جوں توں طے کرتی کرمان شاہ آئی تھی کہ پیغام اجل
آ پہنچا[۱۷] - اس وقت اس دشت نورد کی زبان پر یہ رباعی تھی :

افسانہ درد من اگر گوش کنی   از لیلی و داستانش خاموش کنی
ور قصہ درد ابن عم من شنوی   مجنون و حکایتش فراموش کنی

بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ خدیجہ سلطان کو شعر و سخن کا ذوق تھا اور وہ خود شاعرہ تھی - زخمی نے اس
کے چند اشعار اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں[۱۸]

۱۶ه بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ کچھ اور لوگوں کے نکاح میں بھی آئی -

۱۷ه دیوان رتن سنگھ زخمی، انیس العاشقین، قلمی - شمارہ ۲۳ P. F. I. پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ص ۲۷۵ ب

۱۸ه
من ساقیم و شراب حاضر   ای عاشق تشنہ آب حاضر
آبست شراب پیش لعلم   ہاں لعل من و شراب حاضر
با حسن من آفتاب ہیچ است   اینک من و آفتاب حاضر
گفتی سخنم خوش است یا قند   گر فہم کنی، جواب حاضر
سلطان چو منی نبوده در دہر   عالم عالم کتاب حاضر
من سستی عہد یار می دانستم   بی مہری آن نگار می دانستم
آخر بخزان ہجر خواہم بنشاند   من عادت نوبہار می دانستم

(دیوان رتن سنگھ زخمی، ص ۲۷۵ ب)

والہ کا ایک دوست جسے اس نے ایران بھیجا تھا، واپسی پر خدیجہ سلطان کی وفات کی خبر لایا جس سے والہ کی پریشانیوں میں اضافہ ہوا اور شب و روز بے چینی میں کٹنے لگے۔ چند سال بعد احباب کے اصرار پر والہ نے شادی پر آمادگی ظاہر کر دی اور بالآخر اس نے شادی کر لی۔ اس کی اولاد میں تذکرہ نویسوں نے صرف اس کی ایک دختر گنا بیگم کا ذکر کیا ہے جو اردو کی شاعرہ تھی[۱۵] گنا بیگم کی شادی عماد الملک غازی الدین سے ہوئی تھی۔ ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔

عبدالحکیم حاکم لکھتا ہے کہ " والہ بہت خوش پوش، خوش گفتار، خوش کلام اور خوش معاش شخص تھا۔ فراخ دستی کی وجہ سے وہ اکثر مقروض رہتا تھا۔ فارغ اوقات میں شعر گوئی اور تذکرہ نویسی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک دن وہ فکرِ غزل میں محو تھا۔ یہ فقیر (حاکم) اور میر علی فروغ پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہمیں اپنی غزل کا یہ شعر سنایا[۱۶]

آب حیات و کیمیا، عمر دوبارہ و وفا — این ہمہ می رسد بہم، یار بہم نمی رسد

پھر انھوں نے خواہش کی کہ ہم بھی اس زمین میں غزل کہیں۔ میر علی فروغ نے کچھ شعر کہے اور میں نے بھی اپنی استعداد کے مطابق فکرِ غزل کی اور جو کچھ مجھے حاصل ہو سکا وہ میں نے غزل کی صورت میں پیش کیا۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے:

صبر و قرار و جان و دل، مصرعِ والہم ربود — این ہمہ می رسد بہم، یار بہم نمی رسد

ہماری غزلیں سن کر والہ بہت محظوظ ہوئے اور تعریف و تحسین کی۔" حاکم نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجھے مولوی محمود نے بتایا تھا کہ " نواب والہ حالتِ نزع میں بھی فکرِ شعر کر رہے تھے۔ ملا عبداللہ نے انھیں اس حالت میں دیکھا تو کہنے لگا" آقا! فکرِ شعر کا یہ کون سا وقت ہے، یہ وقت کلمہ پڑھنے اور ایمان تازہ کرنے کا ہے۔ اس کے جواب میں والہ نے یہ رباعی کہہ دی:

گر جان رود م ز تن، نخواہم مردن — ور خاک شود بدن، نخواہم مردن
گویند علی قلی بمرد، این غلط است — او یارم تو مرد، من نخواہم مردن

---

[۱۵] نگارستان دنانسی، ج ۱، ص ۴۸۸، ۴۸۹
[۱۶] مردم دیدہ، ص ۱۰۲

والہ نے چھیالیس برس کی عمر پائی۔ گلشن جو اس کا ملازم تھا وہ اپنی مثنوی "صورت حال" میں لکھتا ہے کہ مجھے والہ کی وفات یعنی یکم رجب ۱۱۶۹ھ / یکم اپریل ۱۷۵۵ء - ۱۷۵۶ء تک ان کے ہاں رہنے کا شرف حاصل رہا[۵۲۱]۔ وفات والہ کی دہلی میں ہوئی تھی۔

تصنیفات

والہ کی تصنیفات جو اہم ہونے کے باوجود تشنۂ طباعت ہیں، درج ذیل ہیں:

۱۔ نجم الہدیٰ: یہ ایک طویل صوفیانہ مثنوی ہے جس سے والہ کے صوفیانہ عقاید پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کی تکمیل ۱۱۴۹ھ / ۱۷۳۶ء میں ہوئی۔

۲۔ دیوان والہ: تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے، اس کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے[۵۲۲]۔ یہ دیوان ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۴ء میں تکمیل پذیر ہوا۔ اسے میر شمس الدین عباسی دہلوی نے مرتب کیا۔ موضوعِ مقالہ کے اعتبار سے یہ تو ممکن نہیں کہ اس کے کلام کا تجزیہ کیا جائے، البتہ ضمناً اس کے متعلق اسی قدر عرض کیا جائے گا کہ والہ پر عشق کی واردات گزر چکی تھی، خدیجہ سلطان کی محبت میں جو اسے ناکامی ہوئی، اس سے سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہوئی اور اس کی شاعری ذاتی جذبات و واردات کی شاعری بن گئی۔ قلبی واردات کے صعود و ارتفاع نے اسے بالآخر تصوف کی طرف مائل کیا، چنانچہ والہ کی غزلیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے وارداتِ عشق و مستی میں تصوف اور اسرارِ معرفت کا رنگ جھلکتا ہے۔

غزل گوئی کے فن میں والہ بابا فغانی سے متاثر معلوم ہوتا ہے، چنانچہ روشِ تازہ گوئی جس کا فغانی مجتہد ہے، والہ کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ لیکن بقول آرزو جو چاشنی والہ کے کلام میں ہے، وہ فغانی کے کلام میں نہیں[۵۲۳]۔

والہ کا اسلوب تازہ و شگفتہ ہے۔ اشعار میں بڑی سلاست و بلاغت ہے۔ سوز و گداز نے والہ کے کلام کو پُر اثر اور دلکش بنا دیا ہے۔ یہاں چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

---

۵۲۱ چارلس ریو، کیٹیلاگ مخطوطات فارسی، ص ۷۱۵

۵۲۲ شمارہ ۱۷۸۳ / ۱۸۰۵

۵۲۳ بحوالہ مردم دیدہ، ص ۱۰۲

چو شمع قصۂ شوقم بانتہا نرسید — دمید صبح و مرا با تو گفتگو باقیست
کوتاہ شد فسانۂ عمر دراز خضر — ہر جا حدیث آن سر زلف دراز رفت
بشوق وصل تو عمری ندم در تقوی — تو یار درد کشاں بودہ ای و من غافل

۳- میرزا نامہ : یہ رومانی مثنوی شیرافگن کی داستانِ عشق ہے، اس کا سالِ تصنیف ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء ہے۔

۴- تذکرہ ریاض الشعرا کی تکمیل بھی ۱۱۶۱ھ ہی میں ہوئی۔ ریاض الشعرا کے متعدد قلمی نسخے دنیا کے مشہور کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ بعض کتاب خانوں کے مخطوطات کی فہرستوں کا ذکر درج ذیل ہے جن میں علی قلی والہ کے احوال و آثار درج ہیں اور جو میرے زیرِ مطالعہ رہے۔

1. Hermann Ethe : Catalogue of Persian manuscripts in The Library of India office no 695, p 1708

2. Charles Riev : Catalogue of Persian manuscripts in The British Museum, vol I, p 371.

3. Wladimir Ivanon : Concise descriptive Catalogue of Persian manuscripts in The Collection of the Asiatice Society of Bengal, no 230, p 76.

4. Hermann Ethe : Catalogue of The Persian, Turkish Hindustani manuscripts in The Bodlien Library, no 377, page 231.

5. A sprenger : Catalogue of the Arabic, Persian and Hindustani manuscripts, no 18, page 132.

6. W. Pertsh : Berlin Catalogue of the Libraries of The Kings of ovdh, page 657.

7. بانکی پور لائبریری، ج ۸، شمارہ ۶۹۳

8. پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ مخطوطہ شمارہ Pf I 17 (نسخہ ۱)

مخطوطہ شمارہ PfI 17a (ن ۲)

مخطوطہ شمارہ ۱۷۸۴، ذخیرہ حافظ محمود شیرانی (ن ۳)

ایک اور مخطوطے کا بھی پتا چلا جس تک میری دسترس نہ ہو سکی۔

راقم الحروف کے پیش نظر پنجاب یونیورسٹی کے مندرجہ بالا یہ تین نسخے تھے۔ ان کی ظاہری حالت درج ذیل ہے۔

ن ۱ : کرم خوردہ، خط شکستہ، اوراق ۱۹۸ (صفحات ۳۹۶) - آخری چند صفحات موجود نہیں، اس لیے کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ہر صفحے میں ۱۷ سطر اور ہر سطر میں ۱۲ الفاظ ہیں۔ لمبائی ۲۴ سنٹی میٹر، چوڑائی ۱۵ سنٹی میٹر اور ۵ ملی میٹر ہے۔

ن ۲ : خط شکستہ، کاغذ حنائی، اوراق ۲۰۵ (صفحات ۴۱۰) سطور ۱۸ فی صفحہ، الفاظ ۱۳ فی سطر لمبائی ۲۶ سنٹی میٹر اور ۵ ملی میٹر، چوڑائی ۱۷ سنٹی میٹر اور ۵ ملی میٹر ہے۔ آخری چند صفحات موجود نہیں، اس لیے کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

ن ۳ : خط جلی، خوب صورت اور دیدہ زیب۔ ہر صفحے پر مختلف رنگوں کے تین تین حاشیے ہیں۔ پہلے دو صفحات مطلا و مذہب ہیں۔ کاغذ حنائی ہے۔ لمبائی ۲۰ سنٹی میٹر، چوڑائی ۱۴ سنٹی میٹر اور ۵ ملی میٹر ہے، اوراق ۲۱۲ (صفحات ۴۲۴) مکتوبہ محمد منصب علی۔ یہ نسخہ دیدہ زیب تو ہے اور اس میں دوسرے نسخوں کی نسبت کہیں زیادہ شعرا کا حال درج ہے لیکن مجھے اس نسخے کے مطابقِ اصل ہونے میں بوجوہ ذیل شبہات ہیں :

۱۔ اس نسخے میں شعرا کے حالات اور انتخاب اشعار دوسرے نسخوں سے یکسر مختلف ہے۔

۲۔ اس نسخے کے ورق نمبر ۹ پر سعید معین الدین کے بیان میں لکھا ہے : " والہ در ریاض الشعرا می نویسد کہ دیوانش راہ دیدہ آم ... " اسی طرح ورق ۲۱ ب پر لکھا ہے : میرزا جلال اسیر از سادات شہرستان است۔ والہ در ریاض الشعرا می نویسد کہ در انشا و شعر نہایت نزاکت و شیرینی بکار بردہ است ... " ورق ۱۷ ا پر ملا ظفر علی جرآت کے حالات میں یہ فقرہ آیا ہے : "والہ در ریاض الشعرا نوشتہ کہ وطنش معلوم نمی شود ... "

۳۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کسی کتاب کا دیباچہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن اس نسخے

میں دیباچہ بارہ الفاظ کی صرف ۳۵ سطروں کا ہے، درآں حالیکہ نسخہ نمبر ا و نسخہ نمبر ۲ میں دیباچہ ۱۸ سطروں کے چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں دیباچوں کا مضمون ایک سا ہے اور نسخہ نمبر ۳ سے یکسر مختلف۔

۴: نسخہ نمبر ۳ اگرچہ بہت ضخیم ہے اور شعرا جن کے حالات درجِ تذکرہ ہیں، بہ کثرت ہیں، لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ مرتب یا کاتب نے بعض دوسرے شعرا کے حالات دیگر ذرائع سے لے کر اس میں شامل کر دیے ہیں۔ اکثر ایسے شعرا کو بھی شاملِ تذکرہ کیا گیا ہے، جن کا ذکر ایک یا دو سطروں سے زیادہ نہیں۔ بعض اہم شخصیتوں کے حالات چند سطروں سے آگے نہیں بڑھے۔

۵۔ ان تینوں نسخوں میں جن مشترک شاعروں کا ذکر آیا ہے، ان کی تعداد صرف ۵۵ ہے۔

۶۔ نسخہ نمبر ۳ کے شعرا کے حالات نسخہ نمبر ا و نسخہ نمبر ۲ سے بالکل مختلف ہیں، لیکن نسخہ نمبر ا و نسخہ نمبر ۲ میں یہ حالات قریب قریب ایک سے ہیں۔ ان امور کے پیشِ نظر راقم الحروف نے نسخہ نمبر ۳ کے بجائے جو خوش خط بھی ہے اور پڑھنے میں بھی کوئی مشکل نہیں پیش آتی، پہلے دو نسخوں ہی کو مطابقِ اصل سمجھا اور انھیں کو بنیادی طور پر استعمال کیا۔

آغازِ تصنیف

والہ نے آغازِ تصنیف کی وجہ اس طرح بیان کی ہے:

"من از دیارِ ایران ببلادِ ہندوستان افتادہ، بمضمون کل اخ یفارقہ اخوہ الا الفرقدان از اہل و اوطان دور و از دوستان مہجور، در زاویۂ خمول روزگاری بسر بردہ، اغلب اوقات خاطرِ افسردہ را بخیالِ شعر و مطالعۂ سفاین و دواوینِ شعرا مشغول ساختہ، بیاض را با سوادِ اعظم مقابل می دید۔"

اگر قدری ندارم پیشِ یاران ولیکن قدرِ یاران می شناسم

و چون خارِ مہاجرتِ دوستانِ سخن گستر و یارانِ نکتہ پرور دلخراش افتادہ بود، بخاطر رسید کہ درین عمل از ذکرِ فضلا و شعرا مجمعی آراستہ و از گل ہای بیاضِ فیاضِ آن چمن آرایانِ بہارستانِ کمال و چہرہ پردازانِ نگارستانِ خیال، دستہ پیراستہ، دلِ غم اندوختہ را تسلی و ازین نکہت دماغِ سوختہ را تازگی نماید۔ لہٰذا از قلتِ بضاعتی و عدمِ سیاحتِ خود نیندیشیدہ، باین عزم تصمیم نمود۔"

والہ یہ بھی لکھتا ہے کہ میرے پیشِ نظر یہ بات رہی کہ شعرا کے اچھے شعر فراہم کروں۔ اس

ذکرے میں میں نے مثنویوں کا ذکر نہیں کیا، صرف انتخابِ اشعار کو قصیدہ، غزل اور رباعی تک محدود کھا ہے۔ والہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اکثر شعرائے زمانۂ سلف اور معاصرین کے دیوان میرے زیرِ مطالعہ تھے۔ شعرا کے تذکروں سے بھی میں نے استفادہ کیا۔"

بعض معاصرین کے ساتھ والہ کے ذاتی روابط تھے، جن کے حالات قلم بند کرنے میں اسے آسانی ہی، مثلاً برہان الملک سعادت خان، محمد علی حزین، فقیر اللہ آفرین، شمس الدین فقیر، دانشمند امید وغیرہم۔

ریاض الشعرا کی ترتیب

شعرا کے حالات والہ نے حروفِ ابجد کی ترتیب سے لکھے ہیں، لیکن شاعر کے نام کے بجائے اس کے تخلص کو عنوانِ سخن بنایا ہے۔ اگر کوئی شاعر کنیت کی وجہ سے مشہور ہوئے، تو اس کا حال کنیت کے تحت آیا ہے۔ ہر حرف کے تحت آنے والے شعرا کے حالات "روضہ" کا نام دے کر شروع کیے ہیں، مثلاً روضۃ الالف، روضۃ الباء وغیرہ۔ اسی بنا پر مصنف نے اپنے تذکرے کو ریاض الشعرا کا نام دیا ہے۔ جو تذکرے میرے پیشِ نظر تھے، ان میں روضوں کی تعداد بیس ہے۔ تذکرے میں قدیم شعرا کو سن وار انے کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن بعد کے شعرا کی ترتیب زمانی قائم نہیں رہ سکی۔

والہ نے تذکرے میں فنِ عروض پر سیر حاصل بحث کی ہے، جو اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ بحث شعرا کے کسی اور تذکرے میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

والہ بحیثیت نقاد

والہ نے شعر کے فکر و فن پر بحیثیت نقاد بھی خیال آرائی کی ہے۔ مثلاً بابا فغانی کے متعلق لکھا ہے:

"بابای مغفور مجتہدِ فنِ تازہ ایست کہ پیش از وی احدی باین روش شعر نگفتہ، پایۂ سخنوری را بجایی رسانیدہ کہ اندیشہ بہ پیرامونِ او نمی تواند پرید۔ اکثر استادانِ زمان، مثلاً وحشی یزدی، مولانا نظیری نیشاپوری، مولانا عرفی شیرازی، حکیم شفائی، حکیم رکنای کاشی وغیرہم مقلد و متبع او یند"[۲۲]

۱۔ بابا فغانی کو والہ نے فنِ تازہ گوئی کا مجتہد بتایا ہے کہ اس سے پہلے اس روش میں کسی نے شعر نہیں کہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس نے پایۂ سخنوری کو اس مرتبے پر پہنچایا ہے کہ عنقائے خیال اس

۲۲۔ ریاض الشعرا، ن ۱، ورق ۱۰۶ ب

تک رسائی نہیں پا سکتا۔

بابا فغانی نے درحقیقت ایک خاص روش تخلیق کی، جسے "تازہ گوئی" کہا جاتا ہے۔ اس روش کی پیروی بعد کے شعرا نے کی۔ مصنف ہفت اقلیم نے یہ کہا ہے: "فغانی شاعر نغز گو بود و در غزل روشِ نو اختراع کرد، اما شعرای خراسان طرز فغانی را مخالفت کردند۔ بنابریں فغانی ہرات را بگزاشت و نزدِ سلطان یعقوب رفت و آنجا مورد التفات شاہانہ شد"[۱۵]

فن تازہ گوئی دراصل نازک خیالیوں اور فکر و خیال کی بلند پروازیوں کا دور ہے، جسے عرفی و فیضی نے عروج تک پہنچایا اور اولیں نقادوں میں والہ داغستانی بھی ہے جس نے فغانی کی شاعری میں اس دور کے آغاز کی نشان دہی کی۔

۲۔ والہ نے بعض اور شعرا کے کلام پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس نے متعدد شعرا کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں، جو ہمارے لیے معلومات افزا ہیں، لیکن جن شعرا کے حالات تک اس کی رسائی نہ ہو سکی، ان کے بارے میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے، محض مدحیہ الفاظ و تراکیب سے کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۳۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض غیر معروف شعرا کو بھی شاملِ تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن برصغیر کے بعض مشہور شعرا نظر انداز کر دیے گئے ہیں، مثلاً عرفی، ظہوری، طالب آملی، منیر لاہوری — عرفی کا نام فغانی کے بیان میں محض ضمناً دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض معاصرین مثلاً سراج الدین آرزو اور غلام علی آزاد کا بھی اس نے ذکر نہیں کیا۔ بعض شعرا کے اہم واقعات نظر انداز ہو گئے ہیں، بعض کی تاریخ وفات، جو بآسانی تذکروں سے مل سکتی تھی، درج نہیں۔ اکثر شعرا کی توصیف میں والہ نے بہت مبالغے سے کام لیا ہے لیکن لسانی تعصب کی بنا پر برصغیر کے بعض نامور شعرا کی زبان دانی پر بھی اسے اعتراض ہے جس کا اظہار اس نے برملا کیا ہے۔

والہ نے بعض شعرا، جو حکومت کے ذمے دار عہدوں پر فائز تھے، کے حالات کے ضمن میں کچھ تاریخی واقعات بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں، مثلاً برہان الملک سعادت خان المتخلص بہ آمین، جو صوبے دار

---

[۱۵] ریاض الشعرا، ن ا، ورق ۱۰۶ ب

تھا، کرنال میں مغلیہ فوج اور نادر شاہی لشکر کے تصادم میں شریک رہا، اسیر بھی ہوا، آخر رہائی
والہ نے اس جنگ کی تفصیل اور برہان الملک کا جاں نثارانہ کردار بھی بیان کیا ہے، اگرچہ والہ کے
بیان سے بعض مورخین کی آرا مختلف ہیں۔[۵۲۶]

برہان الملک کے حالاتِ زندگی تحریر کرتے ہوئے والہ لکھتا ہے کہ "وہ نیشاپور کے سادات
تھا۔ شاہ عالم بہادر شاہ (۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء تا ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء) کے عہدِ حکومت میں ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء
ہندوستان آیا، کچھ عرصہ پریشان حالی میں گزرا۔ محمد فرخ سیر (۱۱۲۴ھ/۱۷۱۳ء تا ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء)
عہد میں حالات سازگار ہوئے، منصب بھی ملا، ترقی بھی پائی۔ فرخ سیر قتل ہوا تو محمد شاہ تخت نشین
(۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) اس کے عہد میں ہفت ہزاری منصب پایا اور اودھ اور لکھنؤ کی صو
سے بھی سرفراز ہوا۔ اس حیثیت میں اس نے ہندوستان کے سرکشوں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ اکثر
اور بڑے بڑے راجے اور زمیندار اس کے اطاعت گزار تھے۔ تحفے تحائف بھی بھیجتے تھے۔ میر
خدمت میں باریاب ہوا، حسنِ اتفاق سے میری قیام گاہ ان کے دولت کدے کے قریب تھی۔ ہ
دوستانہ مراسم استوار ہوئے۔ جب وہ دہلی تشریف لاتے تو اکثر دن اور راتیں ان کی صحبت میں گ
ان کی شفقت اگرچہ خاص و عام پر تھی، لیکن اس فقیر کے حق میں ان کی توجہ اس قدر تھی کہ زبان

---

۵۲۶ خواجہ عبدالکریم نے اس جنگ میں برہان الملک کا کردار کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ نادر شاہ کے حم
مغلیہ فوج نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بادشاہ ہند محمد شاہ نے کرنال کے مقام پر اس کا راستہ روکنا چاہا، شاہی خ
ہوئے۔ ۱۴ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ کو نواب سعادت خاں برہان الملک شاہی خیموں کے قریب خیمہ زن ہوا۔ صبح کے وق
محمد شاہ کے حضور پابوسی کے لیے گیا۔ شاہ، وزیرِ مملکت اور برہان الملک گفتگو میں مصروف تھے کہ جاسوس
ایرانی قزلباشوں نے برہان الملک کے خیموں پر حملہ کر دیا ہے اور چند شخص گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ برہان الملک
اٹھائی اور رخصت کی اجازت چاہی۔ محمد شاہ نے کہا کہ عجلت میں کوئی اہم کام کرنا مناسب نہیں، بہرحال بر
لشکر لے کر میدانِ جنگ کی طرف چل پڑا۔ سپہ سالار خان دوران مدد کو دوڑا، لیکن یہ تو زخمی ہو کر مارا گیا اور بر
گرفتار ہو گیا۔ (خواجہ عبدالکریم: بیانِ واقع، طبع ڈاکٹر کے۔ بی۔ نسیم، ص ۳۲) برہان الملک نے جس طرح گرفت
کیا، اس سے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ پہلے سے نادر شاہ سے ساز باز رکھتا تھا۔ (واقعہ خرابیِ دہلی، ص ۳۹-۴۶) نیز دیکھ

ں کہ اسے بیان کر سکے، برہان الملک ہی کی وساطت سے مجھے دربار شاہی میں بلند مراتب حاصل ہوئے"
ں کا پہلے ذکر آچکا ہے۔

کے بعض معاصرین

شیخ محمد علی حزین، والہ کا ہم وطن تھا۔ اس کے ساتھ اس کے ایران میں بھی مراسم رہے۔ اس کے
ماق لکھا ہے کہ وہ اصلاً لاہیجان کا رہنے والا تھا، کسی مخاصمت کی بنا پر اس پر قتل کا الزام لگایا گیا۔
ں کی وجہ سے وہ کچھ عرصہ روپوش رہا۔ آخر بہ ہزار دقت وہ ساحل ایران پر بندر عباس پہنچا۔ میں
ں ہندوستان جانے کے لیے اس وقت بندر عباس آیا ہوا تھا۔ موسم خوش گوار نہ تھا، اس لیے میں
حزین وہاں سے کرمان چلے آئے، وہاں بھی حزین کے مخالفوں نے اس کا پیچھا کیا، حسن اتفاق سے
م کرمان محمد تقی کے ساتھ میرے روابط تھے، جس کی بنا پر حزین کی گلو خلاصی ہوگئی۔ چند دن بعد ہم دونوں
ر بندر عباس آئے۔ حاکم بندرگاہ میرزا اسمٰعیل زمیندادر تھا، اس نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ حزین تو
ھ دن اس کے ہاں ٹھہرا، لیکن میں جہاز میں سوار ہو کر ہندوستان پہنچ گیا۔ کچھ عرصے بعد حزین بھی
ندوستان آگیا۔ میں سیدھا دہلی آیا اور برہان الملک کے وسیلے سے دربار شاہی سے منسلک ہوا۔ اتفاق
سے حزین بھی دہلی آگیا۔ وہ میرے ہاں ٹھہرا لیکن کچھ عرصے بعد لاہور چلا گیا، لیکن پھر بعد میں دہلی آیا
ور میرے تذکرے کی تالیف تک دہلی ہی میں تھا۔

علی قلی والہ نے حزین کے کلام کی تحسین تو بہت کی ہے، لیکن متعدد اشعار اس کی تنقیص سے بچ
نہیں سکے۔ حزین کے ان اشعار کی بھی نشان دہی کی ہے جو توارد کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ مثالیں والہ
نے محمد عظیم ثبات سے لی ہیں[۷۲]

تعجب کی بات ہے کہ حزین کے سیکڑوں اشعار بطور تحسین و تنقیص والہ نے اپنے تذکرے میں درج

---

[۷۲] بقول خان آرزو محمد عظیم ثبات بنا بر تعصب قریب دو صد بیت ماخذ اشعار حزین برآوردہ۔ چنانچہ پارۂ از آن در تذکرۂ عالی جاہ خان شفقت نشان علی قلی والہ مرقوم است۔ (مجمع النفائس قلمی، ص ۷۰۱) یہاں یہ ذکر کر دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ حزین کے وہ اشعار جو خان آرزو کے نزدیک درست نہ تھے، وہ اس نے اپنی تنقید کے ساتھ تنبیہ الغافلین کی صورت میں مرتب کیے۔ (مخزن الغرائب مؤلفہ شیخ احمد علی ہاشمی بہ اہتمام ڈاکٹر محمد باقر، ج ۱، ص ۸۰۲)

کیے ہیں، لیکن یہ کہیں ذکر نہیں آیا کہ وہ صاحبِ دیوان بھی تھا۔ حزین کے دیوان کا ذکر سراج الدین علی خاں آرزو نے اس طرح کیا ہے: "اس کے جس دیوان کی شہرت ہے، یہ اس کا چوتھا دیوان ہے۔ اس کے تین دیوان ایران میں افغانوں کے حملوں کے دوران ضائع ہو گئے تھے"[۵۲۸]

۳۔ ملا محمد باقر دانش مند کے ساتھ بھی والہ کے دوستانہ مراسم تھے، جو مشہد کا رہنے والا تھا، فرخ سیر کے زمانے میں ہندوستان آیا۔ یہاں کے دربار شاہی کے متوسلین میں شامل ہوا اور دانش مند کا خطاب پایا۔ بعد کو جب محمد شاہ تخت نشین ہوا تو وہ اس کے مصاحبینِ خاص میں شامل تھا۔ اسی اثنا میں حادثہ کرنال پیش آیا، جس میں مغلیہ فوج کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ محمد باقر کا بھائی علی اکبر ملا باستی، جسے محمد شاہ کے دربار میں تقرب حاصل تھا، کسی زمانے میں نادر شاہ کے مصاحبینِ خاص میں شامل رہ چکا تھا۔ محمد شاہ نے ملا علی اکبر کو نادر شاہ سے مصالحت کا ذریعہ بنانا چاہا، لیکن والہ نے جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے، اسے یہ خدمت انجام دینے سے باز رکھنے کی کوشش کی، مبادا نادر شاہ مصالحت کے عہد و پیمان پر قائم نہ رہے اور بادشاہِ ہند پر قابو پا لینے کے بعد عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ دے۔ اس کے بعد یہ خدمت والہ کے سپرد کرنی چاہی۔ اس سلسلے میں والہ لکھتا ہے:

"مجھے خاندانِ تیموریہ کا پاس نمک تھا اور نادر شاہ کے قول و فعل پر اعتماد نہ تھا، اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ حکومتِ تیموریہ کے انقراض کا سبب بنوں اور اپنے ولی نعمت کو اس قہار کے سپرد کر دوں۔ اس لیے بصد التماس معذوری پیش کی، اس پر یہ خدمت دانش مند کے سپرد ہوئی۔ بہرحال اس نے فراست سے کام لے کر نادر شاہ کے عہد و پیمان پر طمانیت کا اظہار کرتے ہوئے مصالحت کا کام انجام دیا"

۴۔ میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی کے متعلق والہ لکھتا ہے کہ وہ فضلائے زمان اور شعرائے دوراں میں ممتاز تھا۔ میرے ساتھ ان کے گہرے روابط تھے، وہ اس محنت کدۂ غربت میں میرے سینۂ فگار پر مرہم رکھنے والے اور دلِ بیمار کے غم گسار تھے۔ جب وہ یہاں سے کہیں جانے کا ارادہ کرتے تو میرا صبر چاک اور میری آہوں کا شعلہ تا افلاک پہنچتا تھا۔ میرے اعتقاد کے مطابق متقدمین یا متاخرین میں

---

۵۲۸ سراج الدین آرزو: مجمع النفائس قلمی، پنجاب یونیورسٹی، شمارہ ۱۲۴ ف ۶، ص ۱۷۰ - ۱۳۶۸

۵۲۹ ریاض الشعرا، ن ا، ورق ۶۴ و

ن کا ہم پلہ نہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ والہ نے یہ تو لکھا ہے کہ میر شمس الدین نے سات ہزار اشعار کا دیوان اور دو مثنویاں ے کیں لیکن جو مثنوی "والہ و سلطان"[۵۳۰] کے نام سے اس نے لکھی اور جو خود والہ کی ناکام محبت کی آئینہ دار اس کا ذکر والہ نے نہیں کیا۔ یہ مثنوی ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء میں تصنیف ہوئی جو ۲۳۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ س کی اس شعر سے ہوئی۔[۵۳۱]

ای والہ حسن دلکشت جان عشق تو بہر دو کون سلطان

د۔ فقیر اللہ آفرین سے جو والہ کی ملاقات ہوئی، اسے اس نے یوں بیان کیا ہے: ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء فرین لاہور میں تھے میں نے انھیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔[۵۳۲] اس زمانے میں انھوں نے گوشہ نشینی ر کر رکھی تھی، اس لیے میری درخواست تو قبول نہ کی، البتہ اپنے مکتوب کے ساتھ ایک قصیدہ اور غزلیں لکھ کر بھیج دیں لیکن جب انھیں قدرے تفصیل سے میرا حال معلوم ہوا، تو میرے ہاں آنے حمت گوارا کر لی۔ چند دن میرے ہاں ٹھہرے، خوب صحبت رہی۔ میں نے انھیں سراپا درد پایا۔ ں ملاقات اور گفتگو سے عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے دردمند انسان کم ہی ہوں گے۔ ب تک لاہور میں رہا، اکثر میرے ہاں آتے رہے۔ ان کی صحبت سے میرے دل کے شور و ولولے اضافہ ہو جاتا تھا۔ میرے تذکرے کی تکمیل سے چند سال پہلے وہ فوت ہو چکے تھے[۵۳۳] لاہور ہی میں ن ہوئے۔

تعجب کی بات ہے کہ والہ نے آفرین کے صاحب تصنیف ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ عبدالحکم حاکم بیان کے مطابق انھوں نے تین مثنویاں تصنیف کیں۔ (۱) ابجد فکر اورنگ زیب کے عہد میں (۲)

---

۵۳۰ سلطان یعنی خدیجہ سلطان

۵۳۱ سپرنگر: کیٹلاگ، ص ۴۰۰۔

۵۳۲ آفرین کو والہ نے دعوت نامے میں یہ شعر بھی لکھا تھا:

پژمردہ ایم بی تو بفریاد ما برس از باغ ما دریغ مدار ای بہار ما

۵۳۳ ان کی تاریخ وفات جس کا ذکر والہ نے نہیں کیا، ۱۱۵۴ھ/ ۱۷۴۱ء۔ (زخمی: انیس العاشقین، ورق ۱۳ ا)

ن معرفت، بہادر شاہ کے زمانے میں (۳) اور میر رانجھا، فرخ سیر کے زمانے میں۔ ان کے علاوہ آفرین
خیم دیوان بھی اس کی یادگار ہے، جس کی غزلیات اور قصائد چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں[۳۴]

۶۔ قزلباش خاں امید[۳۵]۔ اس سے بھی والہ کی صحبت رہی، جو شاہ عالم بہادر شاہ اوّل (۱۱۱۹ھ/
۱۷ء تا ۱۱۲۴ھ/ ۱۲ ۱۷ء) کے زمانے میں برصغیر آیا اور قزلباش کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ دکن میں
ے نواب نظام الملک آصف جاہ کے دربار میں بھی رسائی پائی، وہاں کان الماس کی داروغگی اس
سپرد تھی۔ ۱۱۴۰ھ/ ۲۷ ۱۷ء میں نواب کی رفاقت میں وہ دہلی آیا اور بالآخر دہلی ہی میں مستقل اقامت
بار کرلی۔ تقریباً بارہ سال دہلی میں رہا۔ یہیں والہ کو اس کی صحبت میسّر آئی۔ اس کے متعلق والہ
تا ہے کہ امید بہت خوش گفتار اور شیریں کلام شاعر ہے، جس کی محفل میں جاتا ہے، شعری فضا
چکا چوند پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی وفات کا مجھے سخت صدمہ ہوا[۳۶] ریاض الشعرا کو لکھے ہوئے
سال اور چند مہینے گزرے ہیں، لیکن طبیعت کو روز اوّل کا سا ملال ہے۔ والہ نے یہ رباعی مرثیے
صورت میں کہی:

از رفتن امید دلم خون شد و رفت — با اشک زراہِ دیدہ بیرون شد و رفت
چشم اشک فشاں کہ قطرہ ای بود چہ شد — دل خندہ زنان کہ قطرہ جیحون شد و رفت

امید صاحبِ دیوان بھی تھا[۳۷] جس کا ذکر ریاض الشعرا میں نہیں آیا۔

اختصار کے خیال سے میں اپنا مقالہ علی قلی والہ داغستانی کے صرف ان احباب کے ذکر پر ختم کرتا ہوں
ن کے حالات اس نے خود اپنے ذاتی روابط کی بنا پر لکھے۔

---

۳۴ حاکم : مردم دیدہ ، ص ۱۸

۳۵ مردم دیدہ کے مطابق اس کا نام محمد رضا تھا اور وطن اس کا ہمدان تھا۔ (ص ۴۷)

۳۶ امید کی وفات ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء میں ہوئی۔ (بہ حوالہ شمع انجمن ، ص ۳۶)

۳۷ حاکم : مردم دیدہ ، ص ۴۹